ڈاکٹر روبینہ شہناز

فیض کی مکتوب نگاری

معروف معنوں میں خط ایک ایسی تحریر ہے جو دو اشخاص کے درمیان ذاتی اور نجی نوعیت کا حامل ہوتی ہے۔ تاہم اگر مکتوب نگار یا مکتوب الیہ میں سے کوئی ایک عوامی یا ادبی منصب پر فائز ہو تو اس کی زندگی ذاتی ہونے کے باوجود عمومی دلچسپی کا مرکز ہوتی ہے۔ فیض بھی ایسی ہی ایک مرکزِ نگاہ شخصیت تھے جن کی ادبی زندگی کی ہمہ گیریوں میں شعر و سخن اور صحافت کے علاوہ مکتوب نگاری بھی ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ راول پنڈی سازش کیس کے دوران فیض پاکستان کی مختلف جیلوں میں قید رہے۔ اس عرصے میں فیض نے اپنی بیگم ایلس کو جو خیریت نامے بھیجے فیض کی مکتوب نگاری میں یہ خط سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خطوط انگریزی میں لکھے گئے تھے۔ تاہم بعد میں مرزا ظفر الحسن اور بیگم ایلس فیض کے مسلسل اصرار پر فیض نے ان کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اس طرح خود مصنف ہی جب ان خطوط کا مترجم بنا تو ترجمہ ہونے کے باوجود یہ خط تخلیق کے زمرے میں آ گئے۔

اردو کے مشاہیر شعرا میں سے غالب کے خطوط کو مکتوب نگاری کے میدان میں پہلے سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ مگر غالبؔ اور فیضؔ دونوں کے شاعر ہونے کے باوجود ان کے خطوط کی روش جداگانہ ہے۔ غالب کے خط ان کی ذات کا انکشاف اور شخصیت کے گوشوں کو بھی بے نقاب کرتے ہیں اور اپنے عہد کی داستان بھی سناتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ خطوط اردو نثر کو سنگلاخیوں سے نکال کر آسانیوں کی منزل کا راستہ بتاتے ہیں۔ اس طرح اردو نثر تکلفات، تصنع اور رنگینی الفاظ سے، بے تکلفی، برجستگی، روانی اور شگفتگی کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے۔ یوں یہ مکاتیب غالب کی ذاتی سرگزشت ہونے کے باوجود اردو نثر کے ارتقا کی تاریخ کی ایک کڑی ہیں۔ جب کہ فیضؔ کے خطوط اس صنف کی ارتقائی تاریخ کی کڑی تو نہیں بنتے مگر اُن کی شخصیت کے ان ارتقائی مراحل کو ضرور بیان کرتے ہیں جو فیض کی بحیثیت شخص اور شاعر دونوں طرح کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں۔

پسِ زنداں لکھے گئے مکاتیب کے حوالے سے دیکھیں تو نظر ''غبارِ خاطر'' کی طرف بھی جاتی ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے جیل سے لکھے گئے خطوط کا مجموعہ ہے۔ فیض کے بیش تر خط بھی ایامِ اسیری میں لکھے گئے ہیں۔ حالتِ اسیری کے اشتراک کے باوجود آزاد اور فیض کے رویے اپنے خطوط میں مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ آزاد کے خطوط کا خمیر ان کے بلند علمی مرتبے سے اٹھتا ہے اور یہ آزاد کے آسمانِ علم کے ایسے ستارے ہیں جن کی چمک سے مستفیض ہونے کے لیے صاحبِ بصارت ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ بصیرت ہونا بھی لازم ہے۔ اس کے برعکس فیض کے خطوط کا خمیر ان کی ذات میں پنہاں انکساری اور عجز سے اٹھتا ہے جس میں علم کی وسعتوں اور موشگافیوں کی بجائے رشتوں کی محبت کی چمک موجود ہے۔

فیض کے خطوط کا ایک موازنہ ان کے نظریاتی ساتھی سجاد ظہیر کے ان خطوط سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے بھی

جیل ہی سے اپنی بیگم رضیہ کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط میں سجاد ظہیر کا بنیادی مقصود اپنی ذات کی تطہیر اور دل کے جذبات کو اپنی رفیقۂ حیات کے سامنے کھول کے رکھنا تھا۔ فیض کے خطوط میں ان کا منشا بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ان کی ملاقات پہلے اپنے آپ سے ہوتی ہے۔ فیض کا ظاہر ان کے باطن سے مکالمہ کرتا ہے۔ زنداں کی تنہائی میں یہ خود کلامی جب انھیں یکسانیت اور دوری کے احساس سے دوچار کرتی ہے تو پھر وہ اپنی شریکِ حیات سے باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

''تنہائی اور زباں بندی کے عالم میں بہت دن گزارنے کے بعد آدمی اپنے بارے میں زیادہ باتونی ہو جاتا ہے۔۔۔ مقصود صرف اس خواہش کا اظہار ہے کہ بہت زمانے سے باتیں نہیں کیں، اس لیے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔''[1]

باتیں کرنے کی اس خواہش کے عملی اظہار نے ''صلیبیں مرے دریچے میں'' کی شکل اختیار کی اور ہمیں فیض کی ان باتوں نے ان کی ذات کے اندر جھانکنے کا رستہ بتا دیا۔ فیض کے یہ تمام خطوط چوں کہ جیل سے لکھے گئے تھے اور جیل سے لکھا جانے والا ہر خط سنسر ہو کے باہر جاتا تھا لہٰذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان خطوط میں وہ سب کچھ موجود ہے جو فیض کے ذہن و قلب میں اس وقت موجود تھا۔ مگر اس کے باوجود ان خطوط سے فیض کی جیل کی زندگی کے متعدد گوشے بے نقاب ہوتے ہیں اور ان کی ذات تک پہنچنے کے بہت سے دریچے وا نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکھتے ہیں:

''زنداں میں فیض کو خط لکھنے کی پوری آزادی نہیں تھی۔ وہ اپنے خیالات کا کھُل کر اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بھی خط سنسر کے بغیر باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے ان خطوط میں فیض کی زندگی کی ادھوری سچائی ملتی ہے۔ پھر بھی ان کے ذریعے فیض کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور اپنے اہل و عیال سے ان کی بے پناہ محبت اور دل بستگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ فیض کے یہ خطوط بے حد معلوماتی ہیں۔ ان خطوط سے ان کے مطالعے، ذوق و شوق کا بڑی حد تک پتا چلتا ہے۔''[2]

خطوط کے مذکورہ بالا مجموعے میں ہمیں فیض کی زنداں کی صُبحیں شامیں، ان کے روزمرہ کے معمولات، ان کے مطالعے کی دل چسپیاں، ان کا نظریہ محبت، نظریۂ حسن و زندگی اور بہت سی دیگر باتیں پتا چلتی ہیں جو فیض کی شخصیت کا حصہ تھیں۔

بقول مرزا ظفر الحسن:

''اختصار کے ساتھ ہی سہی مگر ان خطوط میں موضوعات کا بے انتہا تنوع ملے گا۔ محبت، پیار، حسن، زندگی، مطالعہ، شاعری، باغبانی، وقت، حرص، خود پسندی، خود فراموشی، خود بینی، شکایتیں، حکایتیں، کاہلی، کاروبار وغیرہ۔۔۔ عید اور کرسمس کی پارٹیاں، مشاعرے، درسِ قرآن، درسِ غالب، درسِ شکسپیئر، ملاقاتیوں اور مداحوں کے خلوص کا ذکر، پرانی یادیں اور نئے ادبی منصوبے، موسم کا ذکر کیا گیا تو لکھا گرمی بھنگ کا ایک تند و تیز پیالہ ہے۔ بارش کی بات کی تو لاہور اور دلی کو یاد کرنے لگے۔ زندگی کی جدوجہد میں بشاشت اور خوش طبعی کی ضرورت، دردِ جگر اور شکستہ دل کا مداوا، نیکو کار نظامِ حیات کی تشریح، جیل کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خود غرضیاں، کاہلی اور سہل انگاری کا جواز، غرض جتنے خط اس سے زیادہ باتیں ہر بات نئی اور نکھری ہوئی۔''[3]

موضوعات کی اس طویل فہرست میں جو باتیں ان خطوط میں سب سے نمایاں ہیں ان کا تعلق فیض کی شخصی اور جذباتی زندگی سے ہے۔ خاص طور پر مکتوب الیہ یعنی ایلس سے ان کی بے پناہ محبت اور ان کی قربانیوں کو نگاہِ رشک سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ ایلس کے لیے فیضؔ کے جذباتِ احسان مندی کا اظہار واضح طور پر نظر آتا ہے۔ فیضؔ کے قید ہو جانے سے ان کی گھریلو زندگی کے مسائل، مالی تنگ دستی اور اپنی بچیوں سے دوری کا احساس بہت بڑھ گیا تھا۔ جن کی بڑھتی ہوئی عمریں تھیں اور بقول فیض جن کی تربیت میں ان کا حصہ بھی ہونا چاہیے تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''تمہارا ۲۳ تاریخ کا لکھا ہوا خط بچوں کی تصاویر سمیت آج ملا۔ تمہارے بچے کتنے خوب صورت ہیں اور کتنے بڑے نظر آنے لگے ہیں۔ یہاں اور باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں انھیں اپنے سامنے بڑا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اگرچہ تمہاری نگرانی میں ان کی تربیت کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں ہے۔ ان کی تربیت میں میرا اتنا حصہ ہو سکتا تھا کہ انھیں خوش رہنا سکھاؤں اور ان کی خوب ناز برداری کروں۔ اگر وہ خود غرض، کم ظرف اور حریص نہ بن جائیں (اور مجھے معلوم ہے کہ ایسا نہیں ہوگا) اور اگر ان میں یہ شعور پیدا ہو جائے کہ کیا چیز باعزت ہے اور کیا نہیں تو وہ جیسے بھی اپنی زندگی بسر کریں ٹھیک ہے۔''[۴]

یہاں فیض ہمیں شاعر کے بجائے ایک فکر مند مشرقی باپ کی صورت میں نظر آ رہے ہیں۔ جو اپنی اولاد کی ناز برداری بھی اٹھانا چاہ رہا ہے مگر ساتھ ہی ان کی تربیت میں اپنے حصے کا کردار ادا کرنے کی آرزو بھی رکھتا ہے۔ فکر مند باپ کے ساتھ ساتھ ہمیں فیض ان خطوط میں ایک ایسے ذمے دار اور دردمند شوہر کی صورت میں بھی نظر آتے ہیں جس کو نہ صرف اپنی بیوی کی تنہائی کا احساس ہے بلکہ گھر داری میں جو مشکلات ہیں ان کا احساس بھی شدت کے ساتھ دامن گیر ہے۔ ابتدائی خطوط میں سے ایک خط میں گھر کے خالی کیے جانے کے نوٹس پر شدید پریشانی کا اظہار ہے تو کسی دوسرے خط میں اپنی والدہ کی صحت اور حالات پر دل و دماغ کے آزردہ ہونے کا پتا ملتا ہے:

''اماں کے بارے میں دل بہت پریشان ہے۔ میں انھیں خط لکھ رہا ہوں لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا جب تک میں خود وہاں نہیں ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ غم و آلام کے ہجوم میں کہیں ان کی ہمت جواب نہ دے جائے۔ کتنی ظالمانہ بات ہے کہ تن تنہا ہمیں پالنے پوسنے اور کسی قابل بنانے کے لیے عمر بھر کی طویل اور کڑی جدوجہد کے بعد اب اس عمر میں انھیں پھر ویسی ہی تنگ دستی اور محرومی کا سامنا ہے جو اس جدوجہد کے آغاز میں تھا۔ اور بہت سے جانکاہ صدمے اس کے علاوہ لیکن میں جانتا ہوں کہ یہاں اپنے بس میں کچھ بھی نہیں ہے۔''[۵]

بقول فیض ان جانکاہ صدمات سے نکلنے کی کوئی سبیل ان کے پاس نہ تھی مگر فی الحقیقت فیض نے ان تمام مسائل اور آلام کو اپنی اس رجائیت پسندانہ طبیعت سے دبا کے رکھا ہوا تھا جو ان کی شاعری کے نظامِ فکر میں موجود تھی۔ اس رجائیت کے پس منظر میں ایک طرف تو ان کے نظریات موجود تھے تو دوسری طرف ان کے رویے میں موجود رومانیت کا عنصر بھی انھیں اس تخریب سے تعمیر کے پہلو تراشنے کی ترغیب دیتا رہا۔ بیوی بچوں کی سالگرہ کا دن ہو یا ان کی اپنی شادی کی سالگرہ کا دن، عید کا تہوار ہو یا

کرسمس کا دن، ہر ایک موقعے پر انھوں نے قید کے دوران آنے والے اس دن کی تلخی کو گزرے ہوئے اچھے دنوں کو یاد کر کے یا آنے والے اچھے دنوں کی امید میں نہ صرف کم کیا بلکہ خود کو بھی تسلی دی اور اپنے اہل خانہ کو بہلانے کا سامان بھی کیا۔

''کل عید کا دن تھا۔۔۔ صبح جب میں کپڑے بدل رہا تھا تو بہت سی پرانی یادیں اور بہت سے بھولے بسرے خیال اپنی اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور میں نے دیکھا کہ عید گاہ میں گھنے پیڑوں کے تلے میرے ابا خطبہ دے رہے ہیں اور میں نے دیکھا کہ اگلی صف میں مَیں اور طفیل مخمل کے کوٹ پہنے بیٹھے ہیں اور پھر نماز کے بعد فٹن عید گاہ سے چلی ہے۔ گھوڑوں کی گردن میں بندھی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ سائیس سڑک کی دونوں جانب پیسے پھینک رہا ہے اور شور مچاتے ہوئے بچے گھر تک ہماری گاڑی کے ساتھ دوڑے جا رہے ہیں۔ پھر وہ گھڑی یاد آئی کہ ہم زنان خانے کے صحن میں داخل ہوئے ہیں جو بہت سی عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ میری سگی بہنیں ہیں، ان کے بچے ہیں، خادمائیں ہیں اپنے گاؤں کی غریب مہمان عورتیں ہیں۔ ہمارے ابا کے داخل ہوتے ہی یکا یک صحن میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ باری باری سب ان کا ہاتھ چومتے ہیں پھر ہماری دادی راستہ ٹٹولتی ہوئی اپنے کمرے میں سے نکلتی ہیں اور ہمارے ابا ماں کی دعا کے لیے اپنا بارعب سر ان کے آگے جھکا دیتے ہیں اور وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہیں اور دعائیں دیتی ہیں۔ پھر ابا باہر مردانے میں چلے جاتے ہیں۔ سکوت ٹوٹ جاتا ہے اور صحن میں سب لوگ ہنسی مذاق اور شور وغل سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ سب محبتیں، سارے غم، سب خوشیاں یاد آئیں۔''(۶)

خط کے اس طویل اقتباس میں ہمیں فیض بظاہر ایک ایسے رومانویت پرست نظر آتے ہیں جو فراریت کے راستے پر گامزن ہیں۔ موجودہ تلخی کو گذشتہ کی آسودہ یادوں سے کم ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ ایسا لگ رہا ہے وہ خیال کی اس حسین وادی میں کچھ لمحوں کے لیے جا کر آباد بھی ہو گئے ہیں۔ مگر فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ ماضی کی یہ حسین اور دل پسند یادیں جیل کی مشکلات بھری زندگی میں فیض کے لیے ہوا کے کسی خوش گوار جھونکے سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتیں جو ایک چھناکے سے آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اسی لیے ان گزری خوشیوں کو گلے لگا کر رونے کی خواہش کے باوجود وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ بقول فیض ''دل نے چاہا کہ ان سب (خوشیوں) کو گلے لگا کر آہ وزاری کرے لیکن آہ وزاری شروع ہونے سے پہلے میں نے ان سب کو رخصت کر دیا۔''(۷) یادِ ماضی کو فیض ایک حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں جو تنہائی، بے بسی اور جدائی کے گراں لمحوں کے بوجھ کو ایک حد تک کم کر دیتا ہے۔ اسی طرح تخیل میں آنے والے بہتر دنوں کے خواب بھی دیکھتے ہیں جن کی ممکنہ تعبیر انھیں ایک حد تک طمانیت سے سرشار کرتی ہے۔ انور سدید ''صلیبیں مرے دریچے میں'' میں موجود فیض کے ان خطوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''فیض کے خطوط ازدواجی زندگی اور اپنے بچوں سے گہری محبت کا ایک دل کش نقش مرتب کرتے ہیں۔ دوسری طرف فیض جب سیاسی قیدی کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ زنداں میں بھی زندگی کے نقوش تراشنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور تنہائی کے جاں لیوا احساس کو دوستوں کی محفل، مشاعرہ، باغبانی اور شاعری کے مشاغل سے زائل کر ڈالتے ہیں۔ فیض کے خطوط زنداں کی زندگی کا حقیقی بیانیہ

ہیں۔ان میں جیل کی زندگی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات خودغرضیاں اورتساہل پسندیاں سب اپنے اصلی رنگوں میں سامنے آتی ہیں۔شاید یہ فیض کا رجائی انداز ہے کہ ان خطوط کے عقب سے دردمندی کے بجائے بشاشت کی لہر اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔"۸

"صلیبیں مرے دریچے میں" میں موجود نظموں کا مجموعی تجزیہ کیا جائے تو ہمیں فیض کے ذاتی احوال اوردلی جذبات کے کتھارسس کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی اور سماجی رویوں کے بارے میں بھی پتا چلتا ہے۔فیض کی طبیعت کی سادگی، انکساری اور بے نیازی کے بعض دریچے ان خطوں کی تحریروں سے وا ہوتے ہیں۔جیل کے معمولات مثلاً باغبانی، مختلف موضوعات پر درس دینا اور کتب بینی کے معمولات ان خطوط کے ذریعے عام آدمی تک پہنچتے ہیں۔مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آج کل نطشے کی کتاب "Thus Spake Zarathustra" پڑھ رہا ہوں یہ کتاب پہلے میری نظر سے نہیں گزری تھی۔۔۔اگر نطشے زندہ ہوتا تو جرمنی کے نازیوں سے یقینی لڑتا۔اس وجہ سے کہ نازیوں نے اس کے فکر وخیال کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اوراس کی تحریر کے اصلی خدوخال بالکل مسخ کر دیے ہیں۔تھا تو وہ بھی پاجی لیکن بہت حساس اور شاعرانہ قسم کا۔اس کتاب کے جو حصے مجھے پسند آئے کسی دن تمھیں سناؤں گا۔"۹

فیض کی بہت سی نظموں اورغزلوں کے محرکات کا سراغ بھی ہمیں ان خطوط سے ملتا ہے۔علاوہ ازیں ان خطوں سے ہمیں فیض کے دوست واحباب کے بارے میں ان کے خیالات اور احساسات کا علم بھی ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی جیل کی بے ذائقہ زندگی کے بے رنگ معمولات میں فیض کے شاعرانہ مزاج نے جو رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے اس کا پتا بھی چلتا ہے۔مجموعی طور پر اگرچہ یہ خطوط فیض کی زندگی کے چار سالہ عرصے پر محیط ہیں مگر ان سے ہمیں فیض کی گذشتہ اور آنے والی زندگی کے بھرپور نقش مرتب ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ان خطوں کا مجموعی اسلوبیاتی رویہ فیض کی شاعرانہ شخصیت کے زیر اثر نظر آتا ہے اور جس طرح فیض کی شاعری رواں دواں اور مترنم فضا کی حامل ہے، ان خطوط میں بھی اس لہجے کی بازگشت واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ایک مثال ملاحظہ ہو:

"آج اتوار ہے۔صبح آنکھ کھلی تو روزمرہ کی طرح اپنی بارک کی بے رونق دیواروں اور چارپائیوں کے جم غفیر کی بجائے ایک نرم ونازک پودے پر نظر پڑی جو ہوا میں جھوم رہا تھا۔اس کے حسین پتوں میں سے دور کہیں ایک آدھ ستارہ جھانک رہا تھا اور ایک بہت بڑا سفید پرندہ مروارید رنگ آسمان کی جانب محوِ پرواز تھا۔۔۔روشنی اور آسمان دن رات میں کئی بار دل تڑپا دینے والے رنگ بدلتے ہیں۔خاص طور سے شام ڈھلے جب پہلے پہل ستارے طلوع ہوتے ہیں تو آسمان کے نظارے سے محض وسعت اور فاصلے ہی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ اس میں رنگ وحرکت کے اتار چڑھاؤ سے ایسے گونا گوں نقشے بنتے ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔آج کل بہت شدت سے اپنی زندگی کا سب سے دل کش بسیرا یاد آ رہا ہے یعنی دہلی روڈ والا گھر اور بارش کے بعد گردوپیش کا سماں۔۔۔وہ ہمارے گھر کے سامنے کا طلسمی پل اور اسے چومتی ہوئی کہکشاں کی کمان۔اس درد کی چبھن دل میں نہ ہو تو آدمی

کبھی پوری طرح محسوس ہی نہ کر پائے کہ زندگی کس قدر مہربان اور کتنی حسین ہے۔''[۱۰]

حال ہی میں فیض کے خطوط کا ایک اور مجموعہ شائع ہوا ہے جو معروف شاعر افتخار عارف کے نام لکھے گئے خطوط پر مبنی ہے۔ اس مجموعے میں کل ۳۸ خطوط ہیں جو بقول مکتوب الیہ ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۴ء کے درمیان ماسکو، بیروت، لاہور اور بعض دیگر مقامات سے وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ ''صلیبیں مرے دریچے میں'' کے مقابلے میں ان خطوط میں سے بہت کم ایسے ہیں جو مفصل کہلائے جا سکتے ہیں۔ زیادہ تر خط مختصر اور اطلاعاتی نوعیت کے ہیں۔ تاہم فیض کی مکتوب نگاری میں ان خطوط کی حیثیت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کیوں کہ افتخار عارف سے فیض کا نہایت قربت کا تعلق تھا اور ان خطوط میں انھوں نے افتخار عارف سے متنوع معاملات پر مکالمہ کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر راشد حمید:

''ان خطوں کے موضوعات متنوع بھی ہیں اور دل چسپ بھی۔ اگر کسی خط میں ذاتی موضوعات پر گفتگو غالب ہے تو اختتام پر کوئی غزل یا نظم افتخار عارف صاحب کے ملاحظہ و مطالعے کے لیے رقم کر دی گئی ہے۔ اسی طرح دوستوں کا کوئی واقعہ یا اپنا کوئی مطالبہ خط کا موضوع ہے تو آئندہ ملاقات کی خوش خبری پر خط اختتام پذیر ہوتا ہے۔ احباب کے تعزیت نامے، تقریبات، ملک میں اور ملک سے باہر پذیرائی اور عالمی سیاسی منظر نامے کے سلسلے میں گفتگو، علمی و ادبی، مذہبی و فلسفیانہ موشگافیوں پر تبادلۂ خیال اور نہ جانے کیا کیا ان خطوط کے موضوعات ہیں جن سے فیض صاحب کی شخصیت تخلیقی حوالوں سے ہٹ کر بھی بلند قامت ثابت ہوتی ہے۔''[۱۱]

اس کتاب کی اہم بات یہ ہے کہ اس میں فیض کے جو خطوط شائع کیے گئے ہیں ان کا عکس بھی کتاب میں دے دیا گیا ہے اس طرح فیض کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریروں کی موجودگی سے اس کتاب کی تاریخی و تحقیقی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان خطوط میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جنھیں پڑھ کر ان کی تفصیل کی طلب پیدا ہوتی ہے اور بعض اشخاص کے نام اور ان سے متعلق کی گئی بات کو جاننے کا اشتیاق بھی پیدا ہوتا ہے۔ مرتب نے اس طرح کے تجسس کی تشفی کا اہتمام اس طرح کیا ہے کہ خطوط میں واقع ایسے تمام امور کی نشان دہی کر کے مکتوب الیہ سے ان واقعات اور احباب کی تفصیل انٹرویو کی شکل میں معلوم کر کے کتاب میں شامل کر دی ہے جو قاری کی علمی طمانیت کا باعث ہے۔

کتاب میں موجود خط نمبر ۲۲ اور ۲۳ کے مندرجات بہت دل چسپی کے حامل ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا ظفر الحسن کا انتقال ہو گیا اور افتخار عارف نے فیض کو فون پر ''مرزا'' کی وفات کی اطلاع دی۔ فیض نے مرزا ظفر الحسن کے بجائے ڈاکٹر ایوب مرزا کو فوت سمجھ لیا اور اگلے خط میں افتخار عارف کو لکھتے ہیں:

''آج افتخار عارف نے ٹیلی فون پر بتایا کہ ڈاکٹر ایوب مرزا چلے گئے۔ اے وائے وطن جہاں جرأت اور مروّت، دیانت اور فطانت اخلاص و وفا، صدق و صفا کی نقدی کا سراغ ڈھونڈے ہی سے کسی کی ذات میں یک جا ملتا ہے، اس صف سے کسی کا اچانک بے وقت اٹھ جانا کیا الم ناک سانحہ ہے۔ انھی اوصاف سے متصف ہمارے صدیق عزیز ڈاکٹر ایوب مرزا کی شخصیت تھی۔ طالب علم تھے تو طلبا کی سرگرم قیادت کی۔ فارغ ہوئے تو طبابت میں نام پیدا کیا۔ قلم سنبھالا تو انشا پردازی کے جوہر

دکھائے۔ انبوہ خلق کی خدمت گزاری اور ان گنت دوستوں کی دل داری کی۔ ان کے چلے جانے سے کتنی محفلیں اور کتنے گھر سوگوار ہوئے ہوں گے، اے وائے۔

اک گل کے مرجھانے سے کیا گلشن میں کہرام مچا
اک چہرہ مرجھا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے'' ۱۲

مگر جب ایلس کے خط سے انھیں یہ خبر ہوئی کہ ایوب مرزا نہیں بلکہ ظفر الحسن فوت ہوئے ہیں انھیں اس تعزیت سے ایک طرح کی ندامت اور تاسف ہوا۔ چنانچہ اگلے خط میں لکھتے ہیں:

''تمہارے ٹیلی فون سے بہت گھپلا ہو گیا نہ جانے تم نے غلط کہا یا ہم نے غلط سنا لیکن مرزا کے نام سے کچھ ایسے اوسان خطا ہوئے کہ کچھ اور پوچھا ہی نہیں۔ اب ایلس کے خط سے پتہ چلا کہ مرحوم مرزا ظفر الحسن تھے۔ وہ بھی اتنے ہی عزیز تھے لیکن ان کی دیرینہ علالت کے پیش نظر یہ سانحہ کچھ ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔ اب ان کے بارے میں کل گھر جا کر کچھ لکھیں گے۔ اس مغالطے پر تاسف ہے۔'' ۱۳

ان خطوط میں فیض کی بعض تخلیقات کی اولین صورت اور ان کا پس منظر ملتا ہے۔ فیض نے بیش تر خطوط بیروت میں قیام کے دوران میں لکھے ہیں جس سے اس زمانے میں لبنان و فلسطین کے حالات اور تحریکِ آزادیِ فلسطین کے بعض حالات بھی سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی دوران فیض علاج کے سلسلے میں ماسکو گئے اور وہاں ہسپتال میں داخل رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے جتنے بھی خطوط لکھے ہیں ان کی بیماری کی مجموعی صورتحال سامنے آتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ خطوط فیض کی زندگی کے آخری چند سالوں کی سرگزشت ہیں جن سے فیض کے ادبی، شخصی اور اعتقادی رویوں کی آسانی سے تفہیم کی جاسکتی ہے۔

حواشی:

۱ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، مکتبۂ دانیال، کراچی، ۱۹۷۶ء، خط نمبر ۲، ص ۳۰، ۳۱۔
۲ اشفاق احمد اعظمی، ڈاکٹر، ''صلیبیں مرے دریچے میں: ایک مطالعہ'' مشمولہ ''فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ'' مرتبہ: خلیق انجم، ڈاکٹر، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۴۔
۳ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، ص ۱۸۔
۴ ایضاً، خط نمبر ۹، ص ۴۰۔
۵ ایضاً، ص ۱۱۳۔
۶ ایضاً، خط نمبر ۸۳، ص ۱۶۲، ۱۶۳۔
۷ ایضاً، خط نمبر ۸۳۔
۸ انور سدید، ڈاکٹر، ''خطوط کے آئینے میں''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۳۸۔
۹ فیض احمد فیض، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، خط نمبر ۴۱، ص ۱۰۰۔
۱۰ ایضاً، خط نمبر ۲۰، ص ۴۱، ۴۲۔
۱۱ ''فیض بنام افتخار عارف''، مرتبہ: راشد حمید، ڈاکٹر، ص ۱۱۔

۱۲۔ راشد حمید، ڈاکٹر (مرتب)، ''فیض بنام افتخار عارف''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۵۴۔
۱۳۔ ''فیض بنام افتخار عارف''، مرتبہ: راشد حمید، ڈاکٹر، ص ۵۵۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:
۱۔ اعظمی، اشفاق احمد، (۱۹۸۵ء)، ''صلیبیں مرے دریچے میں: اک مطالعہ، مشمولہ: ''فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ''، مرتب: انجم، خلیق، انجمن ترقی اردو، دہلی۔
۲۔ حمید، راشد، (۲۰۱۱ء)، ''فیض بنام افتخار عارف''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۳۔ سدید، انور، (۲۰۰۸ء)، ''خطوط کے آئینے میں''، مقبول اکیڈمی، لاہور۔
۴۔ فیض، فیض احمد، (۱۹۷۶ء)، ''صلیبیں مرے دریچے میں''، مکتبہ دانیال، کراچی۔